انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام[1]

(عبد الحمید ایم اے)

وہ دورِ تہذیب جس میں ہم اس وقت سانس لے رہے ہیں تاریخِ انسانی کا سب سے نرالا دور ہے۔ یہ پہلا دور ہے جس میں انسان نے ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق خالقِ کائنات کو دنیا کے سارے معاملات سے بے دخل کر دیا، اور اپنے فکر و عمل کی سر بفلک عمارت خالص الحاد کی بنیادوں پر استوار کی۔ اس تجربہ سے انسان کو بڑی ہی توقعات وابستہ تھیں، وہ سمجھتا تھا کہ علوم و فنون کی ترقی اور سرمایہ داری نظام کی دولت آفرینی انسانی زندگی کے تمام اخلاقی اور معاشی مسائل حل کر دے گی مگر افسوس کہ مغربی تہذیب و تمدن کا پودا پوری طرح بار آور ہونے کے بعد جو پھل انسانیت کی جھولی میں گرا رہا ہے وہ اتنے کڑوے اور تلخ ہیں کہ اس تمدن کے باغبانوں کو بھی سخت حیرت ہوتی ہے اور اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ آخر اس کے لگانے میں کونسی ایسی خامی رہ گئی ہے جس کی وجہ سے نتیجہ ان کی امید کے مطابق نہیں نکلا۔ مگر چونکہ ان کے فکر کا رقاص صرف حسّی فلسفۂ زندگی کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور ہے اس لیے وہ اس راہ سے ہٹ کر کسی نئی راہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ابھی تک اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ مصائب کا سرچشمہ اس شجرِ خبیث کی محض شاخوں میں ہے۔ اس لیے وہ شاخوں کی قطع و برید میں اپنا قیمتی وقت اور محنتیں ضائع کر رہے ہیں مگر نہیں سمجھتے کہ خرابی جو کچھ ہے اس درخت کی جڑ میں ہے اور اصلِ فاسد سے فرعِ صالح نکلنے کی امید رکھنا نادانی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

اس تہذیب کا تجزیہ کرنے سے پہلے چند امور کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ کسی نظریہ کا صحیح تجزیہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم بالکل خالی الذہن ہو کر اس کے متعلق غور کریں اور اگر ہم اس پر غور کرنے سے پہلے ہی ایک رائے قائم کر لیں تو ہم صحیح نتائج پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس تمدن کی

[1] اس کا خاکہ نعیم صاحب کی تقریر تحریکِ اسلامی کا دوسری تحریکات سے تقابل سے لیا گیا ہے۔

رنگا رنگ کلیوں کو چٹکتے دیکھ کر حیرت زدہ نہ ہو جائیں بلکہ اس کی جڑوں میں اُتر کر دیکھیں کہ وہ کس قسم کی ہیں اور جو اندازہ لگائیں کہ اس غازۂ تہذیب کے نیچے انسانی فطرت کی کونسی سیاہی اور حرص و تصرف کی کونسی قوتیں کارفرما ہیں۔

ثانیاً، حیات، تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے۔ انسان کے سارے افکار و اعمال کا مقصد صرف یہی ہے کہ اس کی زندگی شاندار، موثر اور افزوں ہو جائے۔ کسی تہذیب و تمدن کی کامیابی کا معیار یہ نہیں کہ افکار کے شیش محل کھڑے کر دے بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کو صبر و سکون کی نعمت سے مالا مال کر دے اور پوری نوعِ انسانی کو تاریکی اور درندگی سے نکال کر اس مقام پر لے آئے جہاں وہ اطمینان کے ساتھ اپنا سفرِ حیات جاری رکھ سکے۔ جو تہذیب انسانیت کو زیادہ سے زیادہ ذہنی سکون اور اطمینانِ قلب بخش دے وہ کامیاب ہے ورنہ ناکام۔

ثالثاً، ممکن ہے سطح بین آنکھوں کو سرمایہ داری، فاشزم اور اشتراکیت کے مابین ایک بنیادی فرق دکھائی دیتا ہو۔ مگر درحقیقت سرمایہ داری، فاشزم اور اشتمالیت ایک بڑے "ازم" کے مختلف پرتو ہیں جس کو حسیت (Sensate) کہا جاتا ہے۔

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

ان کے درمیان جو فرق ہے وہ صرف تفصیلات میں ہے۔ اصل میں یہ سب ایک ہی ہیں۔ کیونکہ ان کے ظاہری اختلافات کے باوجود جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے ان کی تربیت ہوئی ہے ان کا مزاج ایک ہے۔ سرمایہ داری نام ہے ایک ایسی معاشی تنظیم کا جس کی غایت اولیٰ مادی منافع کا حصول ہے۔ اشتمالیت اس سے اگلا قدم ہے جس میں تمام چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو ختم کر کے پوری کی پوری معاشی اور معاشرتی زندگی کو ایک بہت بڑے سرمایہ دار یعنی ریاست کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ فاشزم، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان ایک تیسری راہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ، جرمنی اور اٹلی، روس اور اس کے ہمنوا ممالک کے طرزِ عمل میں بہت حد تک یگانگت ہے۔ ان

میں سے ہر ملک نے اپنی ذاتی منفعت کے پیش نظر پچھلے چند سال میں اخلاقی حدود کو نہایت ہی بیدردی سے پامال کیا ہے۔ گزشتہ جنگ میں فسطائی اٹلی کے فرانس پر حملے اور روس کی جاپان پر فوج کشی میں جبکہ وہ میدانِ جنگ میں بازی ہار چکا تھا کونسا بنیادی فرق ہے۔ مزدوروں کی جنت میں بھی سرمایہ دارانہ ممالک کی طرح ہی سارے ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ یہاں بھی ظلم و ستم کا اسی طرح دور دورہ ہے جس طرح کہ فسطائی ممالک میں، یہاں بھی ذاتی منفعت تمام دوسرے محرکات پر غالب ہے یہاں بھی کمزوروں پر اسی طرح ستم ڈھائے جا رہے ہیں جس طرح کہ سرمایہ دارانہ حکومتوں میں۔ کوئی ایماندار شخص بھی جو بصارت رکھتا ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ روسی آمر کا راج ظلم کے اعتبار سے نازی آمریت اور چرچل کی نام نہاد جمہوریت سے کسی طرح کم نہیں۔ اس یکسانیت کی آخر اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ جس بیج سے یہ کونپلیں پھوٹی ہیں وہ ایک ہی ہے۔

بیسویں صدی کی مغربی تہذیب کوئی ایسی نوعمر تہذیب نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں نہ ہوئی ہو۔ دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس کا نسبی تعلق یونانی اور رومی تہذیب سے ہے۔ ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام اور اجتماعی فلسفہ اور عقلی و عملی سرمایہ چھوڑا وہ اس کے حصہ میں آیا۔[۱] اس کے سارے رجحانات اور خصوصیات اس کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئے۔

یونانی تہذیب مغربی ذہنیت کا سب سے پہلا اور واضح نمونہ تھی۔ یہ وہ پہلا تمدن تھا جو خالص حسی فلسفہ حیات کی بنیاد پر قائم ہوا اور یونانی قوم ایک مخصوص نظریۂ تمدن کے علمبردار کی حیثیت سے دنیا پر چھا گئی۔ مسلمانوں کے عروج کے ساتھ اس تمدن کو بھی زوال آیا مگر یہ دنیا سے نیست و نابود نہ ہوا اور اب انیسویں صدی میں اس نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا۔ اس لباس کی چمک دمک سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ نیا ہے لیکن دراصل اس کا تانا بانا یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔ مغربی حکما نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ چند سال پیشتر ڈاکٹر ہاس نے جنیوا میں "یورپی تمدن کیا ہے" کے عنوان سے تین لیکچر دیے تھے۔ ان کا اقتباس خالدہ ادیب خانم کے توسط سے پیش کیا جاتا ہے۔

"موجودہ مغربی تمدن کا مرکز قدیم یونان تھا۔ اس کا اصل الاصول انسان کی تمام قوتوں کا ہم آہنگ

نشوونما اور سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا تھا۔ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے۔جسمانی تربیت، ورزشی کھیلوں اور رقص وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ذہنی تعلیم جو شاعری، موسیقی، ڈراما، فلسفہ اور سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی۔ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتی تھی تاکہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔یونان کے مذہب میں نہ روحانیت کا مغز ہے نہ باطنیت کا۔ نہ علم دین ہے نہ پیشوایانِ دین کا طبقہ۔"

یونانیوں کے جانشین رومی ہوئے اور قوت مملکت کی تنظیم، سلطنت کی وسعت اور عسکری صفات میں ان پر فوقیت لے گئے لیکن علم و ادب، تہذیب و شائستگی میں وہ یونانیوں کے درجۂ کمال کو نہ پہنچ سکے۔اس وجہ سے ان کے ذہنوں پر یونانیوں کی گرفت ہمیشہ مضبوط رہی۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ یونانی تمدن سے مغلوب رہے۔چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ قدیم ترین رومی مورخین یونان ہی کی زبان میں تصنیف کرتے تھے۔اور یہ دستور عرصۂ دراز تک قائم رہا۔اور صرف تصنیف و تالیف پر کیا موقوف، اطوار و خصائل، طرزِ معاشرت، جذبات و احساسات غرض ہر شعبۂ حیات میں یونانی تمدن رومی تمدن پر غالب آگیا۔رومی بلا تکلف یونانیوں کی تقلید کرتے تھے اور اس تقلید پر فخر کرتے تھے[۵]۔اس طرح علم و ادب، اطوار و اخلاق کے ذریعہ یونانی قوم کا کلچر رومیوں میں منتقل ہو گیا۔

اس دور کا ایک بڑا انقلاب انگیز واقعہ عیسائیت کا بت پرست روما کے تختِ سلطنت پر فائز ہونا تھا۔مورخین قسطنطین کی قبولِ مسیحیت کو عیسائیت کی فتح خیال کرتے ہیں مگر درحقیقت یہ ایک حادثہ تھا جس سے عیسائیت کو سابقہ پیش آیا۔جب دنیا پرست لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہ مذہب اب ریاست کا مذہب بن گیا ہے تو وہ بغیر کسی فکر و نظر کے انقلاب کے محض دنیوی فوائد و لذائذ کو سمیٹنے کے لیے عیسائی بن گئے۔ ڈریپر لکھتا ہے:۔

"فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے ملنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیادار لوگ جنہیں مذہب کی ذرّہ بھر پروا نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ

[۵] تاریخ اخلاق یورپ از لیکی

جوشیلے حامی ہو گئے۔ چونکہ وہ بظاہر عیسائی لیکن بہ باطن مشرک و بت پرست تھے۔ لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی۔ قسطنطین نے بھی جو انہی کا ہم مشرب تھا۔ کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرز عمل کا سدباب ہو۔ قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گذری۔ اور کہیں آخری وقت جا کر اس نے ان مذہبی رسوم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے[1]۔

"اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنے ڈھب کا سمجھا اسی کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن یہ قدرت اسے پھر بھی حاصل نہیں ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کا کلی استیصال کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے۔ اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی اور عیسائیت کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں[2]"۔

مذہب کی یہ مسخ شدہ صورت رومیوں کی زندگیوں کو کسی جہت سے بھی بہتر نہ بنا سکی۔ کیونکہ مذہب اب ایک ایسا بے جان ڈھانچہ تھا جس میں سے تخلیقی روح بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ رومیوں کو ترقی کی راہ پر لگانے کی بجائے تنزل کے گہرے غاروں میں لے گیا۔ کہ جن سے کوئی زندگی بخش نعرہ بلند نہ ہوتا بلکہ صرف تعطل اور جمود کے درس دیئے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل روما میں سے ایک گروہ اگر عیش و عشرت کا پرستار ہو کر رہ گیا تھا تو دوسری طرف اہل مذہب پر مردم آزار، آدم بیزار اور دشمن فطرت رہبانیت کا جنون طاری تھا۔ اور اس میں ان کے ہاں اتنا غلو تھا کہ موجودہ زمانہ میں اس کا قیاس کرنا بھی مشکل ہے۔ اس نے انسان کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالا۔ روم کی مادہ پرستی کے خلاف ردّ عمل کے طور پر ایک طبقہ نے اسے قبول تو کیا۔ مگر وہ جلد ہی اس کی سختیوں سے گھبرا اٹھا اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی راہیں نکالنا شروع کر دیں۔ دبی ہوئی مظلوم فطرت کچھ وقت گزرنے کے بعد انتقام پر آمادہ ہوئی۔ اور مذہبی نظام کو اندر ہی اندر ایسا کھوکھلا کر دیا کہ راہبوں کے مسکن بدمعاشی اور عیاشی کے اڈے بن گئے۔ بڑے بڑے

[1] معرکہ مذہب و سائنس مترجمہ مولانا ظفر علی خاں۔

[2] " " " " " " "

پادریوں پر بھی بیب اخلاقی جرائم کے الزامات عائد کیے گئے۔ سینٹ جروم کا مقولہ ہے کہ اہل کلیسا کے تعیش کے سامنے امراء اور دولتمندوں کی عیش و عشرت بھی شرماتی تھی۔ خود پوپ اخلاقی انحطاط میں مبتلا تھے اور دولت کی ہوس اور مال کا عشق تو ان پر اتنا غالب تھا کہ منصب اور عہدے معمولی سامان تجارت کی طرح بکتے تھے، اور کبھی کبھی ان کا نیلام ہوتا تھا۔ جنت کے قبالے، مغفرت کے پروانے، نقض قانون کے اجازت نامے اور نجات کے سرٹیفکیٹ جائداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح بے تکلف فروخت ہوتے تھے۔ مذہبی عہدہ دار سخت راشی اور سود خوار تھے۔ فضول خرچی اور اسراف کا یہ حال تھا کہ پاپائے انوسنٹ ہشتم نے پاپائیت کا تاج رہن رکھا۔ اور پاپائے لیودہم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اڑا ڈالی یعنی سابق پوپ نے جو دولت چھوڑی تھی وہ خرچ کی۔ اس کے بعد اپنی دولت اڑائی۔ جب یہ بھی کافی نہ ہوئی۔ تو اپنے جانشین کی آمدنی کو پہلے سے وصول کر کے صرف کر ڈالا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مملکتِ فرانس کی پوری آمدنی بھی ان پاپاؤں کے اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتی تھی[1]

اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں عقلیت (Rationalism) نے جنم لیا۔ فکر و نظر کی یہ تبدیلی ان مسلم فاتحین کی مرہون منت ہے جو دورِ متوسط میں نئے افکار کے ساتھ دنیائے مغرب میں داخل ہوتے۔ یہ لوگ اگرچہ ہدایت الٰہی کے ان معنوں میں علمبردار نہ تھے جن میں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام تھے۔ ان میں کافی حد تک دنیا پرستی آ چکی تھی۔ مگر اس کے باوجود جو نیا نظام حیات وہ دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے وہ کسی حد تک مسخ ہونے کے باوجود بھی مذہبی عقائد میں تعقل، علوم و فنون میں تجربہ و تحقیق۔ سیاست میں ایک پاکیزہ جمہوریت اور معاشرت میں اخوت و مساوات کے گوناگوں مظاہر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ان کے اپنے کردار کو اگرچہ قرن اول کے مسلمانوں سے دور کی بھی نسبت نہ تھی تاہم عیسائیت کے پیروؤں کے مقابلے میں ان کے فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت اور مزاج میں اعتدال زیادہ تھا۔ ان کے ذہن نسبتہً وسیع اور نگاہیں زیادہ بلند تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مسلم فاتحین اہل مغرب کو اپنے نظامِ حیات کا مومن نہ بنا سکے، لیکن انہوں نے ان کو اور ان کی تاریخ کو شدید طور پر متاثر کیا۔ ان کی پوری زندگی میں ایک

[1] معرکۂ مذہب و سائنس

عظیم تموج رونما ہوا۔ انسانیت کے جسم میں گرم خون کی لہر دوڑ گئی نبض میں حرکت اور جسم میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا۔ تقلید کی زنجیریں ٹوٹنا شروع ہو گئیں۔ ان روشن خیال مفکّرین نے بڑی جسارت سے ان تمام بے اصل نظریات کی تردید کی۔ جو جغرافیہ، تاریخ اور طبیعیات سے متعلق ان کی مذہبی کتابوں میں پائے جاتے تھے۔ ان پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اہلِ کلیسا کی زندگیوں کے بدنما پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ وہ ان مذہبی سوداگروں کی بے رحمی اور بے اصولی کے خلاف بڑی ہی جرأت مندی سے صف آرا ہوئے۔

اُدھر اہلِ مذہب نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرنے کے بجائے اپنے دماغی توازن کو کھو دیا۔ وہ وقتی فائدہ اور نقصان میں اتنا کھو چکے تھے کہ اپنی خلافِ عقل حرکات کے دور رس نتائج سے قطعاً آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے ہر نئی آواز کو بغیر غور کیے دبانا اور کچلنا شروع کر دیا۔ اور اس نئی تحریک کو دبانے کے لیے وہ حربے استعمال کیے۔ اور اتنی سختیاں کیں کہ ان کے تصور سے آج بھی خون کھول اٹھتا ہے۔ طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر انہوں نے ان آزاد خیال لوگوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے شروع کیے۔ مذہبی عدالتیں قائم ہوئیں جنہوں نے ان "باغیوں" کو موت کی سزائیں دیں۔ اندازہ ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزائیں دیں ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں۔ ان میں سے بتیس ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔ انہی زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت و طبیعیات کا مشہور عالم برونو بھی ہے۔ جس کا سب سے بڑا جرم ارباب کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ محکمۂ احتساب کے حکام نے اسے اس سفارش کے ساتھ دنیوی حکام کے سپرد کیا کہ اسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی گرنے نہ پائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا قائل ہے[1]

اہلِ کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور چیرہ دستیوں نے پورے یورپ میں ایک ہلچل مچا دی۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے مفادات کلیسا سے وابستہ تھے۔ سب کے سب کلیسا سے نفرت کرنے لگے۔ اور

[1] مسلمانوں کے زوال سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا " مولانا ابو الحسن علی ندوی

نفرت و عداوت کے اس جوش میں بد قسمتی سے انہوں نے مذہب کے پورے نظام کو تہ و بالا کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ وہ جنگ جو شروع شروع میں عیاش قسم کے اہل کلیسا کے خلاف لڑی جا رہی تھی وہ بعد میں عیسائی مذہب کے خلاف بھی شروع ہو گئی اور اس کے بعد ہر مذہب کے خلاف ان آزاد خیال اور تجدد پسند لوگوں میں اتنا صبر و ضبط، غور و مطالعہ کی قوت اور عقل و اجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور دین کی غلط نمائندگی کرنے والوں کے درمیان تمیز کر سکتے۔ انہوں نے جذبات کی رَو میں بہہ کر یہ سوچنا تک گوارا نہ کیا۔ کہ ان نفرت انگیز واقعات کا دین کہاں تک ذمہ دار ہے۔ اور کہاں تک اس دین کو بیچنے والوں کی ذاتی حرص اور جہالت کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ غصہ میں آکر وہ ہدایت الٰہی کے باغی ہو گئے۔ گویا اہل کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر "تبدیلی" کے جذبات خالص الحاد کے راستہ پر پڑ گئے۔ اور اس طویل کشمکش کے بعد مغرب میں تہذیب الحاد (Secular) کا دَور دَورہ شروع ہوا۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں کے باوجود زندگی کی ساری عمارت کو اس بنیاد پر کھڑا کیا کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ صرف مادّہ ہے۔ نمو، حرکتِ ارادی، احساس، شعور اور فکر سب اسی ترقی یافتہ مادّہ کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں، اسی قسم کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی ارادہ نہیں۔ تہذیب جدید کے معماروں نے اسی فلسفہ کو سامنے رکھ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کی۔ ہر تحریک جس کا آغاز اس مفروضہ پر کیا گیا کہ کوئی خدا نہیں۔ کوئی الہامی ہدایت نہیں، کوئی واجب الاطاعت نظام اخلاق نہیں۔ کوئی حشر نہیں اور کوئی جوابدہی نہیں، ترقی پسند تحریک کہلائی۔ اس طرح یورپ کا رُخ ایک مکمل اور وسیع مادّیت کی طرف پھر گیا۔ خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات، ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں الحاد اس پر پوری طرح غالب آگیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر ہوا اور ابتداء میں تو اس کی رفتار بہت سست تھی لیکن آہستہ آہستہ اس طوفان نے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

فلسفۂ الحاد نے جس برق رفتاری سے دنیا میں ترقی کی۔ اس کی بڑی وجہ لبرلزم (Liberalism) ہے۔ آغاز میں تو اس تحریک نے محض اس لیے سر اٹھایا تھا کہ اس کے ذریعہ عوام کے ذہنوں کو مذہب اور کلیسا کے بندھنوں سے آزاد کرایا جائے۔ اس لحاظ سے یہ نہایت ہی اچھی تحریک تھی۔ اس نے لوگوں میں احساس اور شعور پیدا کیا۔ انہیں حالات پر غور و فکر کرنا سکھایا۔ انہیں یہ بتایا کہ وہ کن کن مظالم کا شکار ہیں، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس آزاد خیالی نے ذہنی انارکی کی شکل اختیار کر لی اور اب روشن خیالی کے یہ معنی قرار پا گئے ہیں کہ انسان کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ مذہب کی عائد کردہ ہو یا سماج کی۔ اس لبرلزم کی عملی انتہا یہ تھی کہ ہر وہ چیز جو پہلے سے چلی آتی ہو، وہ چاہے اپنے اندر صداقت و افادیت کے کتنے ہی پہلو رکھتی ہو، اسے بہر حال رد کر دینا اور اس کے مقابلہ میں کوئی انوکھی اور نئی بات کہنا ہی روشن خیالی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس نظریہ کا اثر اس قدر ہمہ گیر تھا کہ زندگی کے تمام شعبے اس سے متاثر ہوئے[۵]۔

تہذیب الحاد کا دوسرا عنصر ترکیبی مادیت (Materialism) ہے۔ اسے مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں مادہ کے سوا کوئی چیز نہیں۔ . . . .

. . . حتیٰ کہ انسان بھی صرف برقیہ اور سالمیہ ہی کی کرشمہ سازی ہے۔ اسے اس دنیا میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف مادی احتیاجات کی تسکین ہے۔ اس نقطہ تک پہنچنے کے لیے کافی مدت صرف ہوئی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد کچھ مدت تک مادی زندگی اور مسیحی اعمال و رسوم کو جمع کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ مذہب کی پیروی سے وہ پوری طرح آزاد ہونا نہیں چاہتے تھے، اور اسی بات کے آرزومند تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح کم از کم زندگی کے پرائیویٹ معاملات میں مذہبی رسوم کی ضرور پابندی کریں۔ ان کا خیال تھا کہ اسی سے قوم کے افراد کے درمیان ربط قائم رہ سکے گا اور اس طرح ملک اجتماعی انتشار اور اخلاقی ابتری سے محفوظ رہے گا لیکن مادی تہذیب کا ریلا اتنا تیز تھا کہ اس کے سامنے مذہب اس کمزور حیثیت میں کھڑا نہ رہ سکا، اور وقت کے دھارے کی نذر ہو کر رہ گیا اور اس کی جگہ مادہ پرستی نے لے لی۔ مصنفین، اہل قلم اور اہل دماغ گروہ ہو نے

[۵] Harold Laski = The Rise of European Liberalism

نی جادو بیانی، سحر طرازی، اور زورِ خطابت سے قدیم مذہبی رسوم اور قیود کے خلاف ملک میں ایک عام بغاوت برپا کر دی۔ انہوں نے دنیا پرستی کو نہایت ہی دلفریب بنا کر پیش کیا۔ جو چیز اس کی راہ میں حائل ہوئی، اس کے خلاف غیظ و غضب کا جذبہ بھڑکایا اور اس طرح طبیعتوں کو ہر قسم کی قیود و بند سے آزاد کر دیا۔ انہیں زندگی سے بھرپور تمتّع، مطالباتِ نفس کی بے عنان تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی۔ حرص و ہوا کی اس زندگی کی اہمیت جتلانے میں بڑے غلو سے کام لیا گیا۔ نقد نزت اور ظاہری اور محسوس مادی نفع کے سوا ہر چیز کا ابطال کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب صرف مادہ پرستی ہے۔ اس کے متعلق ایک مفکّر نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :-

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریقہ پر سوچتے ہیں۔ اور مذہبی احساس رکھتے ہیں، اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی روح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مگر یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی مشقت کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے اور وہ مادّی ترقی کی پرستش ہے۔ اور اس کی غایتِ حیات صرف یہی ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان، پُر راحت، اور عام محاورے کے مطابق قدرت سے آزاد بنا سکے۔ اس مذہب کے معابد بڑے بڑے کارخانے، کیمیاوی دار الصنعت، ناچ گھر اور بجلی کے مراکز ہیں۔ اس مذہب کے پیشوا بینکوں کے افسر، انجینئر، اداکار، بڑی بڑی صنعتوں کے ناظمین اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ لذت اور طاقت کی اس ہوس اور بھوکے پن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حریف گروہ سامانِ جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں۔ تاکہ جب کبھی ان کے مصالح میں تصادم ہو تو وہ بغیر کسی تاخیر کے ایک دوسرے کو تباہ کر دیں۔ اور جہاں تک تمدن کا تعلق ہے۔ انسانوں کا ایک ایسا گروہ جنم لے چکا ہے جن کے نزدیک نیکی اور اخلاق کا اصلی پیمانہ صرف فائدہٴ ذاتی ہے۔ اور ان کے ہاں بھلائی اور برائی کو جانچنے کا اصلی معیار صرف مادّی کامیابی ہے۔"

بہت ممکن ہے کہ اس بیان کو زیادہ وقعت نہ دی جائے، کیونکہ ان خیالات کا پیش کرنے والا اسلامی افکار سے متاثر ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں چند دوسرے مفکرین کی آراء پیش کرتے ہیں۔ ان سے اس رجحان کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر جوڈ کہتے ہیں۔

"صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے۔ حصولِ دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر محرکاتِ عمل سے زیادہ اور بڑھ کر کارفرما رہی ہے۔ کیونکہ دولت حصولِ ملکیت کا ذریعہ ہے۔ اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور عظمت و شان سے انسان کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سیاسیات، ادب، سینما، ریڈیو اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال بسال سامعین کو یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں تملیکی جذبہ انتہائی ترقی کر چکا ہو۔"[1]

لن یوٹانگ (Linyutong) ایک چینی مفکر نے دورِ جدید کی مادہ پرستی کا نقشہ اپنی کتاب "آنسوؤں اور ہنسی کے درمیان" (Between tears and laughter) میں ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

"اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ معاشی طرزِ فکر نے تمام دوسرے افکار پر غلبہ پا لیا ہے۔ اور اس زمانہ میں معاشی معاملات دوسرے تمام معاملات کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں۔ ہم اس وقت معاشیات کے لگائے ہوئے چرکوں پر معاشیات ہی کا مرہم لگانے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد صرف ایک اچھا کاروبار ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نفع اندوزی اور حصولِ قوت کا نصب العین آئندہ جنگ کا اہم ترین محرک ہے۔ ہمارا دَور ایک ایسا دَور ہے جس میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا بالکل دیوالہ نکل چکا ہے۔ ہمارے افکار پر مادیت پرستی کا غلبہ ہے۔"

یہی مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:-

---

[1] The Philosophy of our Times

"ہمارے افکار کا تانا بانا مادیت ہی سے بنا گیا ہے . . . ہمارے ذہنوں میں جنت کا تخیل بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایسا گودام ہے جس میں مال ہی مال بھرا ہوا ہے اس وقت پوری دنیا ایک کاروبار ہے — سیاسی کاروبار یا معاشی کاروبار — ایک قوم ایک کارخانہ اور ایک حکومت، وہ میز ہے جس پر لین دین کیا جاتا ہے۔ اور اس کے سیاستدان اس کارخانہ کے سیلز مین ہیں، جو ہر وقت اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ اپنے مال کو دوسری منڈیوں میں اوروں کی نسبت زیادہ سے زیادہ فروخت کریں"[1]

اس مادیت پرستی کا یہ اثر ہے کہ اس زمانے میں انسان صرف حصولِ زر اور جلبِ منفعت کے لیے زندہ ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بھی سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ پروفیسر جوڈ نے بالکل سچ کہا تھا:۔

"جو نظریۂ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے۔ وہ اقتصادی نظریہ ہے — یا دوسرے لفظوں میں ہر مسئلے اور معاملے کو پیٹ یا جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور جانچنا"

زرپرستی کے اس جنون نے سب سے زیادہ نقصان اخلاقی قدروں کو پہنچایا ہے۔ چونکہ اب سب سے بڑا مقصد صرف دولت ہی حاصل کرنا ہے اس لیے اس کا حصول سب سے بڑی نیکی ہے۔ دورِ جدید کی کتابِ اخلاق میں بھلائی وہ ہے جس سے مادّی فوائد و لذائذ حاصل ہوں۔ اور برائی نام ہے ان طریقوں کا جن سے ان میں کمی آتی ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اخلاق کی وہ معروضی قدریں جو انسانیت کے مختلف گروہوں اور طبقوں میں کسی نہ کسی حد تک توازن قائم رکھتی تھیں وہ مٹ چکی ہیں۔ اور ان کی جگہ مصلحت پرستی نے لے لی ہے۔ اور یہی مصلحت پرستی اس عہد کا سب سے خطرناک فتنہ ہے۔

الیکسس کیریل (Alexis Carrel) نے اپنی کتاب "انسان نامعلوم" (Man the Unknown) میں کہا ہے:۔

[1] Linyutong: Between tears and laughter, p. 62

"ہماری تہذیب کی یہ مادہ پرستی نہ صرف فکر انسانی کی صحیح پرواز میں حائل ہوتی ہے بلکہ اس نے غور و فکر کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اس نے شریف انسانوں، کمزوروں اور بے سہارا لوگوں اور ایسے تمام انسانوں کو جو دولت کے علاوہ کوئی اور مطمح زندگی رکھتے ہوں نیست و نابود کر دیا ہے۔"

خدا بیزار فلسفۂ زندگی کے مفاسد کا احساس ؟ بعد از خرابی بسیار اب یورپ کے مختلف مکاتب فکر میں تیزی سے پیدا ہو رہا ہے مشہور اخبار نویس (LOIUS FISCHER) نے اپنی کتاب عظیم تحدی (THE GREAT CHALLENGE.) میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے :-

"عہد جدید کے فتنہ کی اصل جڑ یہی ہے کہ انسان کے پیش نظر کوئی اصول نہیں، بلکہ فوری نفع ہے۔ اس لیے وہ ظلم و عدوان کے ہاتھوں میں بالکل بک گیا ہے۔ سیاسی میدانوں میں وقتی مصالح اور حب الوطنی اٹل اصولوں سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ عوام کی غایت حیات اپنے اعتقادات پر کاربند ہونا نہیں، بلکہ ان کا منتہائے مقصود صرف اپنی اپنی حکومتوں کی پیروی کرنا ہے۔ اور تباہی و بربادی کی اصل وجہ یہی ہے۔"

اخلاقی قدریں آجکل محض مقیاس الحرارت کے پارہ کی سی حیثیت رکھتی ہیں، جو واقعات کے ساتھ ساتھ ہر لحظہ بدلتی رہتی ہیں۔ وہ کوئی آخری، حتمی اور قطعی معیار نہیں، جن کے مطابق انسان اپنے اعمال و افکار کو جانچ سکے۔ ان کی اہمیت آجکل صرف اسی قدر ہے کہ وہ ہر قول اور ہر فعل کے لیے، خواہ وہ کتنے ہی ذلیل مقاصد کے لیے کہا اور کیا جاتے، وجہ جواز فراہم کریں۔ انسان جو ذلیل سے ذلیل کام کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ اخلاقیات کا کام صرف اسی قدر ہے کہ وہ اس کی ہر راہ میں کھڑے ہو کر اسے خوش آمدید کہے۔ بہتر ہو گا کہ ہم پروفیسر سارو کن (Prof: Sorokin) کی کتاب (The Crisis of our Age) میں سے چند اقتباسات بھی پیش کر دیں:-

"موجودہ نظام کے حسی اخلاقیات نے انسان کو کافی حد تک ذلیل کر دیا ہے اخلاقی

قدریں بالکل مٹ گئی ہیں۔ ان کی حیثیت آج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اگر ان سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ اس راہ میں مزاحم ہوں تو ان کو بلا تکلف ترک کر دیا جاتا ہے۔ انسان نے آج مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنا لیا ہے، اور اس طرح انہوں نے دنیا میں مستقل کشمکش اور عناد کے بیج بو دیئے ہیں جب ہمارے اخلاقی معیار ہی باہم متصادم ہوں تو اخلاقی قدریں بھی لامحالہ دفن ہو کر رہ جائیں گی۔ ان حالات میں انسانوں پر انکی گرفت کا ڈھیلا پڑ جانا بالکل فطری ہے۔ مسیحیت کے اصول "الفت" کی جگہ اب "نفرت" نے لے لی ہے۔ اب فرد اور فرد کے درمیان منافرت ہے۔ اور ایک گروہ دوسرے گروہ سے برسرپیکار ہے۔ قومیں قوموں کے خلاف، ریاستیں ریاستوں کے خلاف اور نسلیں نسلوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" ایسے مذموم اصول کی پوری دنیا پر فرمان روائی ہے"

"اس وقت شاید ہی کوئی اخلاقی قدر ایسی ہو، جو اشتراکی اور سرمایہ دار، ہٹلر کے پیرو اور یہودی، انگریزی اتحاد اور جرمن اتحاد، کیتھولک اور دہریے، امراء اور غرباء کے درمیان مشترک ہو۔ اخلاقی معیار ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک جو کچھ بھلائی ہے وہی دوسرے کے خیال میں برائی ہے۔ اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ حسی فلسفہ کے ہاں کوئی ایسا پیمانہ نہیں جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ . . . لہٰذا ہم ایک دوسرے سے برسرپیکار افراد کا ایک ایسا گروہ ہیں جن کے پاس عدل و انصاف کا کوئی ترازو نہیں۔ اس کا نتیجہ اخلاقی انارکی کے سوا نہ کچھ ہو سکتا تھا، اور نہ فی الواقع ہے۔ ہر شخص خود اپنا قانون ساز ہے۔ اور ہر کوئی اپنے پیش کردہ معیار کو ہی صحیح تسلیم کرتا ہے"

یہی مصنف موجودہ جنگ و جدال کی وجوہ کا تجزیہ کرتا ہوا ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"چونکہ جسمانی مسرت، افادیت اور حسی لذت ہر فرد اور گروہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے اور جہاں تک چاہتا ہے، ان کو

حاصل کرنے کی سعی کرے۔ حسی خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی تسکین کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ جہاں جسمانی لذت کے چند لوازم فراہم کرنے کے لیے اَن گنت لوگ بیتاب ہوں وہاں ان کا کمیاب ہو جانا ناگزیر ہے۔ اور ان کی کمیابی ہی عہدِ حاضر کی جنگ و جدال کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جنگ و جدال زیادہ شدید صورت اختیار کرتے۔[۱]"

یہ ہے مغربی تہذیب کے اثمار میں سے ایک ثمر جس کی تلخی کا خود اہلِ مغرب کو بھی اب شدید احساس ہو رہا ہے۔

تہذیبِ الحاد کا تیسرا عنصر حاکمیتِ جمہور ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ ایک قوم کے عوام اپنی خواہشات اور اپنی آرا میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ وہ جس شے کو چاہیں، کثرتِ آرا سے اپنے لیے خود حلال یا حرام ٹھیرا سکتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کا کوئی ضابطہ ان کے فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ کسی ریاست کی اصل قوت کا انحصار وہاں کے عوام پر ہوتا ہے، اس لیے اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ حاکمیت بھی انہی کی ہونی چاہیے۔ اس فلسفے کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس نے حاکم اور محکوم کی دوئی کو مٹا دیا ہے۔ اب عوام ہی حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔

فرانسیسی انقلاب سے پیشتر حاکمیت بادشاہوں یا مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اگرچہ اپنے معاملات میں کافی حد تک آزاد تھے، مگر پھر بھی ان پر چند پابندیاں عائد تھیں۔ انگلستان کے دستور میں چند دفعات ایسی تھیں جو ان کے فرماں رواکی طرف سے من مانی کارروائیاں کرنے کی راہ میں حائل ہوتی تھیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک میں بھی رائے عامہ کا دباؤ شہنشاہوں کے عزائم پر کافی حد تک دخل انداز تھا، اور انہیں اپنی خواہشات کی بے قید پیروی سے کسی حد تک روک دیتا تھا۔ مگر اس نئے نظریہ نے کہ حاکمیت کے اصل مالک ملک کے عوام ہی ہیں، فرمانرواؤں پر اس قسم کی تمام پابندیوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ اب عوام خود مختار ہیں کہ وہ جو چاہیں کریں۔ کوئی چیز ان کی راہ نہیں روک سکتی۔

---

[۱] Sorokin The Crisis of our Age

اور اگر یہ کہا جائے کہ مغربی تہذیب کا سب سے بڑا کرشمہ یہ ہے کہ اس نے حاکمیت کو بھی ہر قسم کے بندھنوں سے آزاد کر دیا ہے تو یہ بیجا نہ ہوگا۔

بظاہر یہ نظریہ نہایت ہی معقول معلوم ہوتا ہے۔ اسی کی رو سے عوام کو بادشاہوں کے ظلم و ستم سے نجات حاصل ہوئی۔ انہیں یہ حق نصیب ہوا کہ وہ اپنی بہتری کے لیے ہر قسم کی تدابیر اختیار کر سکیں مگر حاکمیت کو عوام کے ہاتھوں میں اس طرح دے دینے کے بعد بھی انسانیت کے حقیقی مصائب ختم نہیں ہوئے۔ اس فلسفے کی اصل اساس یہ ہے کہ عوام کی مرضی ہی اصل حاکم ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کی مرضی کو کس طرح معلوم کیا جائے۔ ہر فرد کی رائے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اتنی متضاد آرا میں سے ایک ایسی رائے[1] کا تلاش کرنا جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ رائے عامہ سے مراد سارے عوام کی رائے نہیں بلکہ ملک کی اکثریت کی رائے ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کا اندازہ کس طرح لگایا جا سکتا ہے۔ ایک شخص کے لیے جو سماج میں رہتا ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ اپنی صحیح صحیح رائے بغیر کسی دباؤ کے بیان کر دے۔ الفرڈ کابن Alfred Cobbon نے اپنی کتاب The Crisis of Civilization میں کہا ہے :-

"کسی قدیم قوم کے لیے اپنی رائے کا عملی طور پر مظاہرہ کرنا ممکن تھا لیکن اب کثرت آبادی کی وجہ سے جتنے گروہ بڑھتے جائیں گے، اتنا ہی ایک فرد کے لیے یہ مشکل ہوگا کہ وہ اپنی رائے کے مطابق عمل کرے۔ اور اس تناسب سے متضاد آرا بھی معرض وجود میں آئیں گی اس لیے اس کی عملی شکل سوائے نمائندگی کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ مسئلہ ماہرین نفسیات کی سمجھ سے بالا ہے کہ دو، چار یا آٹھ کروڑ انسانوں کی رائے کی صحیح طور پر کس طرح ترجمانی کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک کوئی ایسا سیاسی "منتر" بھی دریافت نہیں ہو سکا، جس کے ذریعے چار کروڑ افراد کی آراء کا اظہار کیا جا سکے۔ ان حالات میں جبکہ نمائندگی کا پورا

[1] روسو نے اسے General will کا نام دیا ہے۔

نظام ــــ مثلاً الیکشن، پارٹیاں، کابینہ ــــ عوام اور "آخری حکمران رائے" کے درمیان حائل ہو، یا یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ عوام کی صحیح رائے معلوم کی جا سکے۔ مختلف سیاسی جماعتوں کا مختلف سیاسی نظریات کے ترجمان کی حیثیت سے جنم لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ سماج میں مختلف مفادات پائے جاتے ہیں۔ اور کسی ایسی سوسائٹی کا تصور بھی ناممکن ہے جس میں سارے افراد کے مفادات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں۔ ان حقائق کے ہوتے ہوتے اگر ہم ایک ریاست کے لیے ایک ہی رائے کے طالب ہوں تو یہ سوائے ایک پارٹی اسٹیٹ یا ایک فرد کی حکومت کے ممکن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نظام نمائندگی (Representative system) رائے عامہ (General will) پیدا کرنے میں سخت ناکام ہوا ہے۔ اور یہ اسی کی ناکامی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے ایک "آمر" کی رائے میں رائے عامہ کی تلاش کی۔ آمریت دراصل جمہوری نظریہ "رائے عامہ" کا منطقی اور طبعی نتیجہ ہے۔ اس ساری بحث کو دو فقروں میں سمیٹا جا سکتا ہے یعنی "جمہوریت اس بات کی متقاضی ہے کہ کوئی صحیح رائے عامہ (General will) ہو۔ اور اس رائے عامہ کے تجریدی تخیل (Abstract idea) کو جب کسی محسوس شکل میں منتقل کیا جاتا ہے تو اسی میں سے منطقی طور پر آمریت اُبھر آتی ہے"[1]

یہ آمریت ضروری نہیں کہ کسی فردِ واحد ہی کی ہو۔ یہ ایک پارٹی یا ایک گروہ کی بھی ہو سکتی ہے۔ البتہ جو چیز ان سب کے درمیان قدر مشترک کی سی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حاکمیت کو ہاتھ میں لے چکنے کے بعد افراد اور گروہ اپنے آپ کو بالکل غیر مسئول سمجھتے ہیں۔ اور زندگی اس طرز پر گزارتے ہیں، گویا وہ کائنات کے بلاشرکتِ غیرے حاکم اور مالک ہیں۔ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے وہ سب انہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اسے جس طرح چاہیں استعمال کریں اور کوئی ان کو ٹوکنے یا پوچھنے کی جرأت نہ کرے۔ الفرڈ کابن نے بالکل درست کہا ہے کہ عوام کو حاکمیت کا سونپ دیا

[1] Alfred Cobban : the Crisis of Civilization p, 67

جانا ان کو وہی حقوق عطا کر دیتا ہے جو "حقوقِ ربانی" کے نظریہ (Divine right of kings) کی رُو سے ازمنۂ وسطیٰ میں بادشاہوں کو حاصل تھے۔ اور اس طرح جن جن بے اعتدالیوں کے پرانے بادشاہ مرتکب ہوتے تھے، انہی بے اعتدالیوں کا ارتکاب آج حاکمیتِ جمہور کے نام پر دنیا کا عیار طبقہ کر رہا ہے۔

اس تہذیبِ الحاد کا ایک اور خطرناک عنصر حیوانی ازدواج کا فلسفہ ہے۔ اس فلسفہ نے اخلاقی قدروں کے آثار تک کو مٹا ڈالا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد جب مزدور طبقہ سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر جینے لگا تو اُسے اس امر کا احساس ہُوا کہ وہ تنہا پورے خاندان کی کفالت کا بار نہیں اُٹھا سکتا۔ چنانچہ وہ اس بات پر مجبور ہُوا کہ گھر سے بچوں اور عورتوں کو بھی فیکٹریوں میں گھسیٹ کر لے آئے تاکہ وہ اور اس کے بال بچے جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھ سکیں۔ اس تغیّر نے سب سے زیادہ صنفِ نازک کو مضطرب کیا۔ وہ ترقی پسندی کے باوجود شرم و حیا کے لباس کو کسی صورت بھی اپنے جسم سے علیحدہ کرنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ مگر اس آڑے وقت میں فلسفی کام آئے۔ انہوں نے فوراً آگے بڑھ کر اُس کے کان میں یہ آواز دی "یہ شرم و حیا اور عصمت و عفت جن کی تو قدر کرتی ہے سب اضافی چیزیں ہیں جو زمانہ کے ساتھ برابر بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی حیثیت ماضی کے افسانوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ درحقیقت یہ سنہری جال ہیں جو تمہارے آباؤ اجداد نے تمہارے لیے تیار کر رکھے تھے۔ مگر اب تمہیں ہوش میں آنا چاہیے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان بوسیدہ رسیوں کو توڑ ڈالو اور ان سے آزادی حاصل کرو۔ تم ہر لحاظ سے مرد کے برابر ہو، لہٰذا تمہیں زندگی کی دوڑ دھوپ میں اس کا شریک ہونا چاہیے۔ اس باطل فلسفہ کا اثر یہ ہُوا کہ پہلے تو نکاح کی گرفت ڈھیلی ہوئی، اُس کے بعد نکاح سے ایک عام بیزاری کا رجحان پرورش پانے لگا۔ مالتھس (Malthus) کے "نظریۂ آبادی" نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور خاندانی نظام کی مضبوط عمارت پیوندِ خاک ہو گئی۔ اس کی تباہی نے انسانی سوسائٹی پر جو اثرات ڈالے اُن کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ بچّوں کی تربیت اور نگہداشت سے عام لاپروائی۔

(ب) صنفی انار کی۔

اس سلسلہ میں مناسب یہ ہے کہ ہم اسی تہذیب کے چند سربرآوردہ داعیوں کی آرا پیش کریں تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ خود اس کے متعلق کس طرز پر سوچتے ہیں۔ پروفیسر سارو کن کہتا ہے:۔

"عہدِ ماضی میں ایک خاندان بچوں کی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ تھا۔ آج سے ایک سو سال پہلے بھی بچوں کی زیادہ تر تعداد اسی سے فیض یاب ہوتی تھی لیکن دورِ جدید میں خاندان کا دائرہ اثر بہت حد تک سکڑ گیا ہے۔ جن گھرانوں میں بچے نہیں ہوتے اُن کے ہاں تو تربیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر جن خاندانوں میں اولاد ہوتی ہے وہاں بھی اُن کی تربیت کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جاتا۔ بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد ہی گھر کے ماحول سے نکال کر نرسری سکولز، کنڈر گارٹن، پرائمری سکولز کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اس طرح سے خاندان کے وجود کا ایک اہم مقصد فوت ہو گیا ہے"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"انسان محض حیاتیاتی وجود ہی نہیں رکھتا جس کا اپنا کوئی رجحان نہ ہو، بلکہ وہ بہت سے میلانات رکھتا ہے۔ اس لیے کوئی ذریعہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو ان میلانات کو صحیح طور پر نشوونما دے سکے پہلے اس فرض کو خاندان سرانجام دیتا اور بچوں کو اجتماعی زندگی کے لیے کارآمد بناتا تھا، مگر آج کل خاندان اس اہم فرض کی بجاآوری میں غفلت برت رہا ہے۔ اس کوتاہی کی اصل وجہ یہ ہے . . . کہ ایک ایسا خاندان جس میں خاوند اور بیوی کے تعلقات کسی مضبوط بنیاد پر استوار نہ ہوں وہاں بچوں کی صحیح طور پر تربیت نہیں ہو سکتی۔ جس کی وجہ سے بچوں میں اچھی صفات پیدا ہونے کی بجائے بہت سی اخلاقی کمزوریاں اُبھر آتی ہیں۔ ایسے خاندانوں میں پرورش پلنے والے بچے بالعموم کم ظرف، تھڑدلے اور منافق ہوتے ہیں۔ اگر باہر کے تعلیمی ادارے تربیت کی اس کمی کو پورا کر سکتے تو پھر بھی کچھ بات تھی، مگر وہ ایسا نہیں کر سکے۔ ایک اَن پڑھ ماں جس میں شفقت اور ذہانت موجود ہو

وہ ان سکولوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کے مقابلہ میں بہتر معلمۂ اخلاق ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ مجرمین، فساق اور فجار کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اب دنیا میں ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں جو نہ تو کسی مضبوط سیرت کے مالک ہیں اور نہ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے[1]"

اسی طرح عہدِ جدید کے ایک دوسرے مفکر (Alexis Carrel) نے بھی خاندانی نظام کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"موجودہ سماج نے سب سے فاش غلطی یہ کی ہے کہ اُس نے تربیت کے لیے خاندان کے مقابلہ میں مدرسوں پر اعتماد کیا۔ آج کی ماں اپنے بچہ کو نرسری سکول میں صرف اس غرض کے لیے چھوڑ دیتی ہے تاکہ وہ اپنی معاش کے لیے، آزاد شہوت رانی کے لیے، فضول قسم کی آرٹ پرستی کے لیے اور برج کھیلنے یا سینما جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت بچا سکے اور اس طرح ایک قسم کی مشغول بیکاری (busy idleness) میں منہمک رہے۔ اس طرز زندگی نے خاندانی نظام کو، جس کے زیر اثر رہ کر بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے، بالکل درہم برہم کر دیا ہے۔ ایک بچہ اپنی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو ماحول کی مدد سے ہی صحیح طور پر نشو ونما دے سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی حد تک الگ تھلگ بھی رہے، مگر خاندان کے افراد کی توجہ کا مرکز بھی ہو[2]"

خاندانی نظام کی بنیادوں کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے خاندان کے چھوٹے افراد کے دلوں میں بڑوں کا احترام ختم ہو گیا ہے اور اسی طرح بڑوں کے دلوں میں بھی چھوٹوں کے لیے کوئی شفقت باقی نہیں رہی۔ آج بیوی اور خاوند اور باپ اور بیٹے کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ صرف معاشی ہے اور اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو دوسرا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ مغربی

---

[1] The Crisis of our Age, p. 190

[2] Alexis Carrel= Man the Unknown

تہذیب کے ایک نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے :-

"اُس زمانہ کی جگہ جس میں خاندانی روابط کا استحکام ہی خاندان اور قبیلہ کی خیر و فلاح کے لیے ضروری تصور کیا جاتا تھا مغرب جدید میں ایک ایسے زمانہ نے لے لی ہے جو وسیع تر عنوانات کے ماتحت اجتماعی تنظیم کرتا ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی میں جو بنیادی طور پر صنعتی ہے، اور جس کی تنظیم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ خالص میکانکی خطوط پر کی جا رہی ہے، ایک فرد کا اپنے باپ کے ساتھ برتاؤ کوئی معاشرتی اہمیت نہیں رکھتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپین باپ کا اپنے بیٹے پر اقتدار ہر آن کم ہو رہا ہے۔ اور اسی طرح بیٹے کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے عزت و احترام کا جذبہ رو بزوال ہے۔ ان کے باہمی تعلقات تیزی کے ساتھ قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں اور عملاً ایک ایسی مشینی سوسائٹی کے ذریعہ ان تعلقات کا خون ہو رہا ہے جس میں افراد کے باہمی حقوق کے منسوخ کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے اور جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خاندانی رشتہ داری کے مقرر کیے ہوئے حقوق بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔"[1]

حیوانی ازدواج کے اس فلسفہ نے جہاں ایک طرف خاندانی نظام کو تباہ و برباد کیا ہے وہاں اُس نے Back to Nature کے رنگین پردے میں پوری دنیا میں اباحیتِ مطلقہ (صنفی انارکزم) کا بیج بو دیا۔ اُس نے لوگوں کو نہایت ہی دلچسپ انداز میں یہ درس دیا کہ آزاد محبت عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ نکاح وغیرہ کی پابندیاں محض مصنوعی ہیں اور تاریخ کے تاریک ادوار کی یادگار ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کا ہر ہوٹل، ہر پارک، ہر کوارٹر عصمت فروشی کا اڈا بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ اور تو اور خود اس تہذیب کے پرستاروں نے اس کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دی ہے۔ ہم اس وقت اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ صرف چند مغربی مفکرین کی شہادتیں پیش کرتے

[1] Islam at the Cross Road

ہیں۔ ان سے ہوا کے رخ کا صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکیگا۔ یورپ کا مشہور مفکر برٹرنڈ رسل اپنی کتاب "اجتماعی تعمیر نو کے اصول" میں لکھتا ہے :-

"ہماری سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں سب سے زیادہ بگاڑ اُس طبقے کے اخلاق میں پیدا ہو رہا ہے جو ہمارے لیے زیادہ مفید اور زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ اگر ہمارا معاشی اور اخلاقی نظام اسی طرح قائم رہے تو آئندہ دو یا تین نسلیں اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے انتہائی خراب نکلیں گی اور یہ مسئلہ صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ تمام مہذب ممالک کو درپیش ہے اور زیادہ صحیح الفاظ میں اس مسئلہ کا تعلق پوری مغربی تہذیب سے ہے۔"

اسی طرح علم طبیعیات کی ایک ماہر عورت مسز ٹرسن کی رائے بھی قابل ذکر ہے۔ وہ کہتی ہے :-

"ہماری تہذیب کی عمارت کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آگیا ہے اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوند خاک ہو جائے ہم گزشتہ کئی سال سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ اب لوگ نظم وضبط کی پابندیوں کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے بقا کی بس ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کر دی جائے۔ کیونکہ اس تہذیب کے لوگوں کی تمام تر توجہات آزاد جنسی تعلقات، قحبہ گری اور عصمت فروشی مختصر یہ کہ جنسی خواہشوں پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ساری تعمیری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اس معاملہ میں اور بھی طرح طرح کی بے اعتدالیاں دیکھنے میں آتی ہیں جیسے مردوں اور عورتوں کا خود اپنے ہی ہم جنسوں کی طرف مائل ہونا۔ انسانی صلاحیتوں کا یہ زیاں بڑا ہی تشویشناک ہے۔

جنسی تعلقات کی یہ نوعیت اور اس کے ان بدترین آثار اور نتائج کو دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ آیا یہ ہماری تہذیب کے ملیامیٹ ہونے کے آثار و شواہد

ہیں یا اس کے اسباب۔ میری یہ رائے ہے کہ یہ آثار و شواہد بھی ہیں اور اسباب بھی۔[1]"

امریکہ اور انگلستان میں اس اخلاقی انحطاط نے سب سے زیادہ خطرناک صورت اختیار کی ہے۔ پچھلے سال امریکہ میں ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام (U. S. A. Confidential) ہے۔ اس کتاب کے مصنفین نے امریکی زندگی کا ایسا گھناؤنا نقشہ پیش کیا ہے جس کے تصور سے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف مارچ ۱۹۵۲ء میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ مغربی تہذیب کے اس گہوارہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"اب جبکہ ہم اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حالات یکسر بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آج ہمارے ہاں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی افراط ہے۔ اب عورتوں کو آزادی ہے اس لیے وہ ہمارا پیچھا کرنے میں بھی آزاد ہیں۔ . . . مردوں کی چشمِ التفات اُن کے لیے ایک ایسی جنس نایاب ہے جس کے لیے انہیں سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ . . .

آپ کو بیسواؤں کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں، آپ ٹیلیفون پر انہیں گھروں میں بلا تکلف بلا سکتے ہیں۔ اس تغیر نے اس پیشہ کے معاشی پہلو میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا ہے۔ اب نہ تو مکانوں کی ضرورت ہے اور نہ سرمائے کی۔ چکلوں میں سوائے نچلے طبقہ کے کوئی نہیں جاتا۔ . . .

بیسواؤں کو اب کمپنی گرلز (company girls) کے لقب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ ان سے سارا معاملہ ڈاکٹر کی طرح فون پر ہی طے ہو جاتا ہے۔ اور ڈاکٹروں کی طرح ہی انہیں مہینے کے آخر میں بل کی ادائیگی کر دی جاتی ہے۔ بعض لوگ انہیں کال گرلز (Call girls) یا پارٹی گرلز کے ناموں سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ ضرورت کے وقت انہیں دعوتوں میں مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ مہذب رنڈیاں تلاش روزگار میں ایک

[1] Sex & Commonsense

ریاست سے دوسری ریاست میں جاتی رہتی ہیں۔"

"صحبت ہم جنس (Homo Sexuality) جس کا رواج زیادہ تر مردوں میں تھا اب عورتوں میں عام ہو رہی ہے۔ کوئی بیوقوف انسان ہی قوم کی اس ابتر اخلاقی حالت کو نظر انداز کر سکتا ہے۔"

قریب قریب یہی حال انگلستان کا بھی ہے۔ (Pat Solan) لنڈن کی اخلاقی حالت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"ایک شخص کے لیے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ وہ لندن کے مرکزی بازار میں سے گزر جائے اور کوئی خاتون اس کو "خوش آمدید" نہ کہے۔ اگر قارئین مجھ پر اعتماد نہ کریں تو میں انہیں آج بھی اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ گیارہ بجے رات کے بعد پیکاڈلی، لیسٹر، ڈرسکوئر، اور ریجنٹ سٹریٹ میں سے شام کے وقت گزر کر دیکھیں۔ انہیں میرے اس دعوے کی صداقت کا خود بخود یقین ہو جائے گا۔"

روس بھی اسی مرض کا شکار ہے۔ اشتراکیت نے وہاں اخلاقی سطح کو اور بھی پست کر دیا ہے۔ اشتراکی راہنماؤں نے زیادہ زور صرف اسی ایک بات پر دیا ہے کہ کوئی چیز بھی اشتمالی سوسائٹی میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔ جنسی عمل میں انسان کو اس کے مذاق اور طبیعت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور آزاد جنسی تعلقات کی استواری کے کلی اختیارات اُسے تفویض کر دیئے گئے ہیں۔

اس آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے شہروں میں جہاں اشتراکی اخلاقیات اور اباحیت مطلقہ کا براہِ راست اثر پڑا وہاں صنفی انارکی نے اخلاقی اقدار کو بالکل مٹا ڈالا۔

مشہور اشتراکی اخبار پراودا (Pravada) میں اب سے کچھ سال پیشتر اشتراکیوں کی جنسی آزادی پر ایک مضمون چھپا تھا جس میں صاف الفاظ میں لکھا گیا تھا کہ محبت کے بارے میں ہمارے نوجوان چند خاص اصول رکھتے ہیں اور ان اصولوں کی تہ میں یہ تخیل کارفرما ہے کہ جس قدر تم حد تک پہنچنے میں کامیاب ہوگے، یا بالفاظِ دیگر جس قدر زیادہ تم حیوانیت سے قریب تر ہو گے، اسی قدر زیادہ تم اشتراکی

ہوگئے لیبر فیکلٹی کا ہر ممبر، ہر طالب علم خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس بات کو اصول متعارفہ میں سے شمار کرتا ہے کہ محبت کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو اس کو اپنے اوپر کوئی قید عائد نہ کرنی چاہیئے۔ اس طرح کے اصول متعارفہ میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ ہر لڑکی جو لیبر فیکلٹی میں داخل ہے اس پر لازم ہے کہ جب اُس کے نوجوان ساتھیوں میں سے کسی کی نظر انتخاب اس پر پڑے تو وہ بلا حیل وحجت اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے۔[1]

اسی طرح ایک ممتاز روسی سائنس دان انیٹون نیمیلوف (Nemilov) جو اشتراکیت کا بڑا پُر جوش حامی ہے، اپنی کتاب "عورت کا حیاتیاتی حزنیہ" (The Biological Tragedy of Woman) میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ مزدوروں میں صنفی انارکی عالمگیر ہوگئی ہے پیٹ سلوان نے اپنی ایک ممتاز تصنیف "روس بے نقاب" (Rusia without Illusion) میں ان عورتوں کا تذکرہ کیا ہے جو روس میں زنا کو اپنا پیشہ بناتے ہوئے ہیں، اور اجنبی مسافروں اور سیاحوں کی تاک میں رہتی ہیں۔ اُس کے دیئے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق صرف ماسکو میں ۲۰۰۰۰ بازاری عورتیں ہیں۔

بدمعاشی کے یہ جراثیم صرف کارخانوں، شہروں اور یونیورسٹیوں میں ہی نہیں بلکہ زراعتی فارموں تک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ موریس ہنڈس ایک اجتماعی فارم کے حالات بطور مثال کے پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"ایک مرد اور عورت اس فارم میں ملازم ہوئے۔ شوہر کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ تین ہفتوں کے قیام کے بعد اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ایک گوالن سے شادی کر لی۔ چند ہی دنوں کے بعد وہ ایک دوسرے ساتھی کی بیوی سے زنا کرتا ہوا پکڑا گیا۔"

روسی لٹریچر میں اس قسم کی اَن گنت مثالیں مل سکتی ہیں۔ ہم طوالت کے خوف سے انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان میں جو کچھ بتانا ہمیں مقصود ہے وہ صرف یہی ہے کہ مغربی تہذیب نے دنیا کے تمام

---

[1] بحوالہ ترجمان القرآن جلد ۱۲ عدد ۱ -

ممالک میں ایک ہی قسم کے جنسی تعلقات کو جنم دیا ہے۔ پروفیسر سار وکن پوری دنیا کی اخلاقی پستی کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے :-

"ہم کھانا اب ہوٹلوں اور ریستوراں میں کھاتے ہیں۔ ہماری روٹی بیکری سے آتی ہے، کپڑے لانڈری میں دھلتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں تفریح کے لیے لوگ خاندانوں کی طرف رجوع کرتے تھے لیکن اب اس کے لیے سینماؤں، تھیٹروں اور کلبوں کا رُخ کیا جاتا ہے۔ پہلے خاندان ہماری دلچسپی کا مرکز تھا اور خاندانی زندگی ہی میں سکون تلاش کیا جاتا۔ مگر اب خاندان کے افراد بکھر گئے ہیں۔ اور اگر کچھ مل کر رہتے بھی ہیں تو اس کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ وہ دن کا زیادہ وقت اکیلے فکرِ معاش میں بسر کرتے ہیں۔ رات کا وقت جس میں کہ خاندان کے افراد اکٹھے ہوتے تھے وہ بھی اب علیحدگی میں گذرتا ہے۔ اب ہمارے گھر ہمارے لیے استراحت کی جگہ نہیں رہے جہاں ہم بہر حال شب باش ہوں، شب باشی کا تو ذکر ہی کیا، اب تو ایک پوری رات بھی لوگ اپنے گھر میں بسر کرنا پسند نہیں کرتے"[1]

اس تہذیب الحاد کا ایک اور زہریلا عنصر قوم پرستی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں مسیحیت اگرچہ ایک زندہ اور متحرک قوت کی حیثیت سے مر چکی تھی مگر اس کا مزار اب بھی پورے یورپ کی اجتماعی زندگی کا مرکز و محور تھا۔ اس میں زندگی کے آثار مٹ جانے کے بعد بھی اتنی کشش باقی تھی کہ لوگ اسی کے اصولوں میں خیر و فلاح تلاش کرتے۔ اس کے اعلیٰ اور ارفع نصب العین اور اس کے بلند و برتر اجتماعی تخیل نے مختلف قوموں اور نسلوں کو جوڑ رکھا تھا۔ مگر جب لوتھر نے اپنی مشہور اصلاحی تحریک شروع کی اور رومی کلیسا کی مخالفت میں جرمن قوم کو اُبھارا اور بالآخر کلیسا کو اس کے مقابلہ میں شکست دیکھنا پڑی، تو قومیں جس شیرازہ میں بندھی ہوئی تھیں اس کی بندش ٹوٹ گئی اور اس طرح ان کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اب ان میں سے ہر ایک نے اپنی خود مختاری کا عَلم بلند کر دیا۔ اس کے بعد یورپ کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس اجتماعی تخیل کے ختم ہو جانے کے بعد

[1] P.A. Sorokin = The Crisis of Our Age

انسانوں کے سامنے کونسا ایسا نصب العین پیش کیا جائے جس کی محبت لوگوں کے اندر سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے تہذیبِ الحاد قوم پرستی کی روح کو سامنے لائی۔ اہلِ یورپ خدا کے انکار کے باوجود کسی ایسے معبود کے متلاشی تھے جس کے سامنے وہ جبینِ نیاز جھکا سکیں۔ دنیا کی بدقسمتی کہ یہی وہ زمانہ تھا جب مغرب کا ذہن و دماغ بھاپ کے دیو کو مسخر کرکے اس سے مشینیں چلانے میں کامیاب ہوا، اور مشینوں کی کثیر پیداآوری اور زود پیداآوری نے یورپ کی بیشتر قوموں کے سامنے تیار شدہ مال کی کھپت کی پیچیدگیاں پیدا کردیں۔ ان کے اپنے عوام اس مال کو خریدنے کی قوت نہ رکھتے تھے چنانچہ اس مال کو فروخت کرنے کے لیے منڈیوں کی جستجو ہونے لگی۔ اور یورپ کی بہت سی قومیں اسی مقصد کے حصول کے لیے اپنے گھروں سے نکل پڑیں۔ اس تگ و دو میں مسابقت کے جذبہ کا ابھرنا بالکل ایک فطری امر تھا۔ مگر اسی مسابقت نے باہمی رقابت کی صورت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف سلطنتوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس آڑے وقت میں جس نظریہ نے لوگوں کو سرگرم عمل کیا اور انہیں لڑنے مرنے پر ابھارا وہ نیشنلزم کا نظریہ تھا۔ مغربی دلوں نے اس نئے بت کے تراشے جانے کے بعد کسی قدر اطمینان محسوس کیا۔ ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کی جگہ پیشانیاں اب اس پیکرِ محسوس کے سامنے جھکنے لگیں۔ اور انسان اپنی زندگی میں بندگی کا جو خلا محسوس کر رہا تھا وہ اس طرح پورا ہو گیا فرد فرد میں یہ احساس ابھرنے لگا کہ اس کی ساری سرگرمیوں کا محور قوم کا بت ہے۔ اس نئے استھان پر اسے سب کچھ بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ سادہ لوح عوام پر یہ جادو چل گیا چنانچہ یورپ کی ساری قومیں قوم پرستی کے نشہ میں بدمست ہو کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں۔ مشہور انگریز فاضل لارڈ لوتھین نے مسلم یونیورسٹی کے خطبہ اسناد میں اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"جب لوتھر کی تحریک نے (جس کو دینی اصلاح کی تحریک کہا جاتا ہے) یورپ کی ثقافتی اور دینی وحدت کا خاتمہ کر دیا تو یہ برِّاعظم مختلف قومی حکومتوں میں بٹ گیا جن کے

جھگڑے اور مقابلے دُنیا کے لیے ایک دائمی اور مستقل خطرہ بن گئے ہیں۔"

دینی انحطاط اور دینی اصُول و اخلاق کی وجہ سے قومیت اور وطنیت کے طرزِ خیال کو جو فروغ ہُوا، اس کی طرف بھی لارڈ موصوف نے اس خطبہ میں متوجہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"دین جو انسان کا ضروری بِناء اخلاقی مقصد کے حصُول اور انسانی زندگی کی عزت اور معنویت کا واحد ذریعہ ہے اس کے اقتدار کے زوال کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مغربی دُنیا ایسے سیاسی مذاہب و خیالات کی گرویدہ بن گئی جن کی بنیاد نسل اور طبقات کے اختلاف پر ہے۔"

آغاز میں اس نئے دین کے سب سے بڑے مبلغ اور پُرجوش حامی صرف وہی لوگ تھے جو صنعتی انقلاب سے پُورا پُورا فائدہ اٹھا کر دولت کے بل پر مسندِ اقتدار پر قابض ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے اس نظریہ کی توسیع و اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور چند سال میں اسے دُنیا کا مقبول ترین نظریہ بنا دیا۔ پروفیسر ہیرلڈ لاسکی (Harlod Laski) نے اپنی کتاب "یورپ میں آزادیٔ افکار کا عروج" The Rise of European Liberalism میں ان اسباب کا تجزیہ کیا ہے جن کی وجہ سے تمام دنیا کا سرمایہ دار طبقہ اس نظریہ کا حامی ہے وہ لکھتا ہے:

"ایک تاجر قوم پرستی کے نظریہ کا اس لیے خیر مقدم کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے ذریعہ ملک کے اندر کامل اتحاد و اتفاق ہونے کی وجہ سے امن امان قائم ہوگا۔ اور اس طرح وہ پُرسکون فضا میں پُوری جمعیتِ خاطر سے تجارت کر سکے گا۔ دوسرے اسے ہم پیشہ لوگوں کی انجمنوں (Guilds) کے قوانین و ضوابط سے آزادی نصیب ہوگی۔ وہ دل و جان سے اس بات کا متمنی ہے کہ مذہب و کلیسا کے اقتدار کا خاتمہ ہو۔ کیونکہ اس کے کمزور پڑ جانے سے حلال و حرام کی قیود بھی ختم ہو جاتی ہیں۔"

سرمایہ داروں کے اس گروہ نے نہایت ہی عیاری سے لوگوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ تجارت کے فروغ میں دراصل کسی ایک طبقہ یا گروہ کا فائدہ نہیں بلکہ پُوری قوم کا فائدہ[1] ہے اس لیے

[1] بعض انجان لوگ ابھی تک قوم پرستی کو حب الوطنی کا ہم معنی خیال کرتے ہیں۔ مگر یہ زبردست غلط فہمی ہے۔ (باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

اُسے چاہیے کہ قوم کی سربلندی کے لیے وہ دوسروں کو شکست دے۔ اسی مذموم خیال کو فلسفہ کے جس رنگین لباس میں پیش کیا گیا۔ وہ ایک نہایت ہی دلچسپ داستان ہے۔

دورِ متوسط میں مادہ سے جو حیرت انگیز کام لیا گیا اُس نے انسان کے ذہن میں اس خیال کو راسخ کر دیا کہ دنیا کے سارے مظاہر میں صرف مادہ ہی جلوہ گر ہے۔ اس کے بعد زندگی کے متعلق یہ نظریہ ترقی پانے لگا کہ یہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا مگر اس سے یہ غلط اصول مستنبط کیا گیا کہ دنیا میں اصل حق "کل" (Whole) ہے۔ اور افراد یا اشیاء کا علٰحدہ وجود سراسر باطل۔ اس اصول نے انفرادیت کی بالکل نفی کر دی۔ پھر عقل کے اندھوں نے پوری دنیا کو ایک "کل" سمجھنے کی بجائے اپنے ملک اور قوم کو کل سمجھا اور لوگوں کو مختلف طریقوں سے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنی انفرادیت کو اس کل کے بحرِ بیکراں میں غرق کر دیں۔ چنانچہ یہی ہوا عوام نے اپنا سب کچھ اسی دیوی کے قدموں میں لا کر ڈال دیا اور عبادت و تقدیس کا جتنا تعلق عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہیئے تھا انھوں نے اس خود ساختہ معبود کے ساتھ قائم کر لیا۔ انسان کے سامنے سب سے بلند مقصد یہ ٹھہرا کہ وہ خود کو قوم کے اندر بالکل تحلیل کر دے۔ مسولینی اس خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"افراد اور گروہوں کے مقابلہ میں اقتدارِ اعلیٰ کی اصل مالک صرف قوم ہے"

یہی نہیں بلکہ قوم نے اپنے لیے اس مرتبہ کا دعویٰ کیا جو مذہب میں شارع کو دیا گیا ہے۔ قوم خطا و نسیان سے معصوم ہے۔ اس سے لغزش اور غلطی کا صدور ممکن نہیں۔ تمام افراد اس کی ملک ہیں اور ان پر اسی کی اطاعت فرضِ عین ہے۔ اس کو حق ہے کہ جس امر میں جو چاہے فیصلہ کرے، فرد کی پہلی اور آخری وفاداری صرف قوم کے لیے ہے۔ اور اس میں کوتاہی کفر سے کم نہیں۔ پروفیسر جوڈ نے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۵) جس کا شکار بعض اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ حب الوطنی ایک مثبت داعیہ ہے اور اس لحاظ سے بالکل فطری ہے۔ مگر قوم پرستی ایک منفی تحریک ہے، جو لوگوں کے اندر دوسری قوموں کے خلاف نفرت کے جذبات کو اُبھارتی ہے۔

ہر فرک، جرمن وزیرِ داخلہ، کا یہ بیان نقل کیا ہے:۔

"قوم کا مفاد ہی دراصل حق کا سب سے بڑا معیار ہے۔ حق وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نفع حاصل ہو اور باطل وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نقصان پہنچے"

چنانچہ جرمنی کی کتاب الایمان کا کلمہ شہادت یہ قرار پایا:۔

"ہٹلر کی خدمت جرمنی کی خدمت ہے اور جرمنی کی خدمت اللہ کی خدمت ہے"

فکر و نظر کی یہ تبدیلی صرف داخلی پالیسی میں واقع ہوئی۔ جہاں تک خارجی پالیسی کا تعلق ہے اس کے نتائج کہیں زیادہ مہلک ثابت ہوتے۔ مختلف قوموں اور ملکوں نے اپنے سیاسی مقصد اور استعمار کے جو چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچ لیے، ان کی حدود سے باہر نکل کر سوچنا اُن کے لیے قریب قریب ناممکن ہوگیا۔ انہوں نے ہر اُس چیز کو باطل خیال کیا جو اُن کی خاکِ وطن سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ اس قوم پرستانہ ذہنیت اور غیر ملکی چیز کے خلاف عصبیت یہاں تک بڑھ گئی کہ قوموں نے کسی غیر ملک سے آئی ہوئی اُن اعلیٰ قدروں کو بھی ماننے سے انکار کر دیا جن کو خدا کے پاک بندوں نے وقتاً فوقتاً پیش کیا تھا اور جن میں کسی ایک قوم یا ملک کے مفاد کی حفاظت مقصود نہ تھی بلکہ پوری نوعِ انسانی کی فلاح مطلوب تھی۔ جرمنی کے ایک پروفیسر اٹر نے کے یہ الفاظ اس ذہنیت کی پوری طرح غمازی کرتے ہیں:۔

"ہمارے بچے کیوں ایک غیر قوم کی تاریخ پڑھیں، انہیں کیوں ابراہیم اور اسحاق کے قصے سنائے جائیں۔ ہمارا خدا جرمنی ہونا چاہیئے[1]"

پھر اس خیال نے کہ حق انہی کی میراث ہے قوم کے اندر نخوت اور تکبر کے جذبات پیدا کیے۔ انہوں نے یہ طے کر لیا کہ جینے اور پھلنے پھولنے کا حق اگر کسی کو ہے تو وہ صرف ان کی اپنی قوم کو ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سراسر باطل ہے اس لیے اس کو مغلوب اور محکوم رہنا چاہیئے۔ مسولینی نے ۱۹۳۵ء میں تقریر کرتے ہوئے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

"اگر یورپ اب دنیا میں اپنا استعماری مشن پھیلانے کے قابل نہیں رہا تو یقیناً

[1] بحوالہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" از مولانا ابوالحسن علی ندوی

اس کا وقت پورا ہو چکا ہے . . . . وحشیوں اور حبشیوں کے اب یہ حوصلے ہو گئے ہیں کہ مجلس اقوام کی عدالت میں آکر ان عظیم الشان قوموں کے خلاف استغاثہ کریں جو عالم انسانیت میں انقلاب بپا کر چکی ہیں"

ہٹلر اپنی مشہور کتاب "میری جدوجہد" میں لکھتا ہے:۔

"دنیا میں علوم و آداب، فنی کمالات و نوادر کا جو بیش قیمت سرمایہ پایا جاتا ہے اس کو چند مخصوص قوموں کی ذہانت و کمال اور قوت ایجاد نے پیدا کیا ہے، اور یہ تمام قومیں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر ہم نوع انسانی کی تین اقوام قرار دیں۔ (۱) علم و تہذیب پیدا کرنے والے (۲) ان کی حفاظت کرنے والے (۳) انکو تباہ کرنے والے، تو پہلی قسم میں صرف آرین نسل آئے گی"

دنیا کی ہر قوم نے نہ صرف اپنے آپ کو دوسروں سے بلند و برتر خیال کیا بلکہ اپنے اجتماعی وجود کا سب سے بڑا مقصد یہ سمجھا کہ وہ دوسروں کو دنیا سے مٹا دے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے اندر ایسے احساسات ابھارے جائیں جن کی وجہ سے قوم کے افراد کے دلوں میں دوسروں کے خلاف اس قدر شدید نفرت پیدا ہو جائے کہ وہ ان کا نام تک سننا گوارا نہ کریں، اور ہمیشہ انہیں ملیا میٹ کر دینے کی فکر میں رہیں۔ اس کام کو بڑے منصوبے کے تحت سر انجام دیا گیا۔ ماہرین نفسیات نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ دوسروں کے خلاف نفرت و حقارت اسی صورت میں پھیلائی جا سکتی ہے کہ ملک کے ماہرین تعلیم اور سیاسی لیڈر اپنی قوم کے بچوں میں خوف و ہراس کے احساسات کو پرورش دیں۔ ان میں تعلیم و تربیت کی ذریعہ، پریس اور ریڈیو کی مدد سے اس خیال کو ابھارا جائے کہ دوسری قومیں تمہاری دشمن ہیں۔ وہ تمہیں تاخت و تاراج کرنے کا عزم رکھتی ہیں لہٰذا تمہارا فرض ہے کہ تم کامل اتحاد و اتفاق سے ان کے خلاف صف آرا ہو جاؤ اور ان کے حملہ کرنے سے پہلے ہی تم اتنی قوت سے ان پر یلغار کر دو کہ ان کا قومی وجود باقی نہ رہے۔ پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:

"مشترک جذبات جن کو آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو باہم متحد بنا سکتے ہیں وہ شفقت و مودت، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ

نفرت اور خوف کے جذبات ہیں۔ انہی کی مدد سے مسند اقتدار حاصل کی جاتی ہے۔ پچھلے الیکشن جن نعروں سے جیتے گئے وہ یہ تھے: قیصر کو تختۂ دار پر لٹکا دو اور جرمنی کو مجبور کرو کہ وہ تاوان جنگ ادا کرے۔ ایک مشہور لیڈر نے مجھ سے خود بیان کیا کہ اس نے ۱۹۱۸ء کے انتخاب میں صرف اس لیے شکست کھائی کیونکہ اس کا مخالف چھ جرمنوں کو ایک ہی پستول سے مارنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لہٰذا جو گروہ کسی قوم پر کسی مقصد کے لیے حکومت کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لیے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کریں جس سے وہ نفرت کرے اور اس کے لیے کوئی شخصیت یا قوم نہ پیدا کریں جس سے وہ ڈرے۔ اگر مجھے واقعی دورِ جدید کی مختلف اقوام کا اتحاد مطلوب ہے تو مجھے چاہیے کہ میں ان کے لیے کسی اور سیارہ پر کسی دشمن کا وجود تلاش کروں۔ اس بنا پر یہ قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ اس زمانہ کی قومی حکومتیں اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت نفرت و حقارت کے زیر اثر رہیں۔ انہی جذبات پر ان سلطنتوں کی زندگی موقوف ہے۔ اور انہی جذبات پر قومی اتحاد کی بنیاد رہتی ہے[۱]۔"

اس سلسلے میں ایک عجیب بات جو دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ کہ دنیا کی ہر قوم یا نسل اپنے مخالف میں اس قسم کے جذبات کو نہایت ہی نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس کے نزدیک اگر یہ احساسات کسی غیر کے اندر موجود ہیں تو نہایت ہی برے ہیں۔ مگر جب انہی خیالات کی پرورش خود اپنی نسل یا قوم میں کی جائے، تو یہی گمراہ کن نظریات صالح افکار میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel) اپنی ایک مشہور کتاب میں لکھتا ہے[۲]:

"ہر فرد اس بات سے متفق ہے کہ دوسرے ممالک کی قوم پرستی ایک نہایت ناپسندیدہ اور نفرت انگیز جذبہ ہے مگر یہی جذبہ جب ان کی اپنی قوم کے اندر پرورش پاتا ہے تو یہ سراپا خیر نظر آنے لگتا ہے اور جو اسے قبول نہیں کرتا وہ قوم کے اندر ذلیل و حقیر ہو جاتا ہے۔"

---

۱ Joad: A Guide to Modern Wickedness

۲ Bertrand Russel: New Hopes for the Changing World p. 69

نیشنلزم کے اس نظریہ کے اندر فساد کے جو بیج دبے ہوئے ہیں وہ ریشہ دوانیوں، وعدہ خلافیوں، کمزور آزاریوں اور جنگی تصادموں اور چالبازیوں کی شکل میں اُگ گئے۔ اس نازک صورتِ حالات نے مغربی زندگی کو بالکل بے اطمینان کر دیا ہے۔ فاتح اور مفتوح دونوں اپنی بربادیوں پر غور کرتے ہیں اور بار بار اس عالمگیر فساد کو ختم کرنے کے متعلق سوچتے ہیں۔ اس غرض کے لیے جمعیت اقوام کی بنا رکھی جاتی ہے۔ مگر تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ یہ اپنے مقاصد میں ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے بالکل درست کہا تھا کہ شاعری کی بحر کی طرح اسم بے مسمّٰی غیر قانونی کارروائیوں کو قانونی جامہ پہنانے اور فتوحات کو ناموں کے تغیّر سے جائز قرار دینے کے علاوہ اس کے وجود کی اور کوئی غرض نہیں اس کا سارا زور صرف اسی ایک بات پر صرف ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کو دبائے اور دست درازوں اور طاقتور سلطنتوں کے مظالم کے لیے وجہ جواز فراہم کرے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ "بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند" اس کے نصب العین کے بالکل صحیح ترجمان ہیں۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ "سنّتِ رسولؐ" از صفحہ ۱۳۱)

اب میں پھر اپنی پہلی بات کی طرف آتا ہوں یعنی یہ کہ کوئی ٹھوس دلیل ملنی چاہیئے اس بات کی کہ خوارج نے حدیثیں گھڑی ہیں، کم از کم میں اب تک، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، کوئی ایسی دلیل نہیں پا سکا۔ اور ایسا ممکن بھی ہو کیونکہ . . . . امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ: "گمراہ فرقوں میں سب سے زیادہ صحیح حدیث بیان کرنے والے خوارج ہیں" امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "گمراہ لوگوں میں خوارج سے زیادہ سچے اور عادل لوگ نہیں مل سکتے" انہی کے بارے میں امام موصوف ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: "یہ لوگ قصداً جھوٹ نہیں بولتے بلکہ سچائی میں مشہور ہیں اور ان کے متعلق عام شہرت یہ ہے کہ یہ لوگ اصدق الحدیث ہیں"

یہ وضع حدیث کا پہلا سبب تھا، آئندہ ہم دوسرے اسباب سے بھی بحث کریں گے (باقی آئندہ)